© rasailojaraid.com

فلسفۂ انسانیت کا ایک تنقیدی جائزہ

از جناب ڈاکٹر محمد نور نبی صاحب لکچرر شعبۂ فلسفہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

فلسفۂ انسانیت (HUMANISM) ایک ایسا اندازِ فکر ہے جس کی رو سے انسان اور ان کے امور و معاملات ان کی استعداد، صلاحیت، خواہشات، بھلائی اور بہبودی بنیادی اہمیت کے حامل ہیں، یہ فلسفہ جو یورپ میں نشاۃ جدیدہ کا مخصوص اندازِ فکر تھا لاطینی لفظ ہیومینس (HUMANUS) سے ماخوذ ہے۔ یہ مکتب خیال انسانی امور و معاملات کا مجموعی طور پر مطالعہ کرتا ہے اور فرد (INDIVIDUAL) خدا (GOD) اور فطرت (NATURE) کو اپنے دائرۂ بحث سے خارج تصور کرتا ہے۔

یونان اور روم کے قدیم کلاسک مفکرین نے ہمیشہ ایک جانب انسانی اور حیوانی زندگی میں فرق و تفریق قائم رکھی اور دوسری جانب ربانی (DIVINE) اور مافوق الادراک قوت میں امتیاز برتا۔ لیکن موخرالذکر یعنی ربانی قوت میں فرق و امتیاز رکھنے کے لئے انھوں نے عام طور پر انسان کے حسرت انگیز، پُردرد و قابلِ رحم پہلوؤں پر مثلاً اس کے فانی ہونے یا خطاکار و گنہگار ہونے پر زیادہ زور دیا۔ از منۂ متوسطی میں تصورِ انسان پر بہرصورت عیسائی عقیدہ "نظریۂ حیاتِ جاودانی" (DOCTRINE OF IMMORTALITY) کا زیادہ غلبہ رہا۔ اس نظریہ نے انسان اور حیوان کے مابین بنیادی حدِ فاصل قائم کی۔ عادات و اطوار کا فرق جو قدیم زمانے میں مہذب و ترقی یافتہ اور غیر تہذیب یافتہ انسانوں کے درمیان معیارِ امتیاز تسلیم کیا جاتا تھا، ترک کردیا گیا اور انسان اور خدا کے مابین گرجا و کلیسا کے ذریعہ قائم کردہ مخصوص رشتہ ہی در اصل اس کرۂ ارض پر حیاتِ انسانی کا اہم ترین پہلو تصور کیا جانے لگا۔ نشاۃِ جدیدہ کے حامیانِ فلسفۂ انسانیت نے اس طرزِ فکر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے خلاف صدائے بغاوت بلند کی جس نے انسان کے فطری لوازم کی جانب سے پہلو تہی اختیار کر رکھی تھی۔

ان روشن خیال اصحابِ فکر و فہم نے ماضی کے غیر اہلِ کتاب (PAGAN AUTHORS) مفکروں کا مطالعہ کرتے ہوئے موت سے پہلے پہلے انسانی زندگی کی اصلی قدر و قیمت کا احساس دلانے کی کوشش کی اور انسان کی امکانی قوت و توانائی کی عظمت و اہمیت کی جانب لوگوں کی توجہ مبذول کرائی۔ جب کلیسائی اثرات ماند پڑنے لگے تو فلسفۂ انسانیت نے سیکولر تقلید پسندی (SECULAR ORTHO DOXIES) کے خلاف تحریک شروع کی جس نے انسان کو سیاسی و حیاتیاتی (BIOLOGICAL) نظریہ کے مجرد تصورات کے دام کا اسیر بنا رکھا تھا۔[1] ڈاکٹر ہیرالڈ ہوفڈنگ فلسفۂ انسانیت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فلسفۂ انسانیت کوئی محض ادبی میلان یا علم اللسان کا کوئی مخصوص مذہب نہیں تھا بلکہ یہ ایک ہمہ گیر میلانِ حیات تھا جس کی خصوصیت یہ تھی کہ فطرتِ انسانی کا بغور مطالعہ کیا جائے اور اسے بنائے عمل قرار دیا جائے"[2]

فلسفۂ انسانیت کے اس مختصر سے تعارف کے بعد اب ہم اس پر تاریخِ فلسفہ کی روشنی میں ایک طائرانہ نظر ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

فلسفۂ انسانیت دو جداگانہ مکاتبِ فکر پر مشتمل ہے، پہلا مکتبِ فکر تصورِ خدا کو اپنا محور و مرکز تسلیم کرتا ہے۔ اس مکتبِ فکر کو ہم دینیت (THE THEOCENTRIC) کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ دوسرا مکتبِ خیال خدا کے برعکس صرف انسان کو اپنی فکر کا محور و مرکز قرار دیتا ہے۔ اس کو ہم بشریت (THE ANTHROPOCENTRIC) کے نام سے پکار سکتے ہیں۔ ابتدائی پندرہ صدی عیسوی تک دینیت مکتبِ فکر کا دور دورہ رہا۔ لیکن بعد کے چار صدیوں میں بشریت مکتبِ خیال نے غلبہ پایا۔

فلسفۂ انسانیت کے دینی مکتبِ فکر (THE THEOCENTRIC SYSTEM) کی تعلیم و تدریس

---

[1] ENCYCLOPAEDIA BRITANNICA V: 11, P. 876

[2] تاریخ فلسفۂ جدید، حصہ اوّل۔ تصنیف۔ ڈاکٹر ہیرالڈ ہوفڈنگ۔

اُردو ترجمہ: ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب۔ (جامعہ عثمانیہ - ۱۹۳۴ء) صفحہ - ۱۶ -

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا فریضہ ازمنہ وسطیٰ میں یورپ اور بیرون یورپ کے ممتاز و مشہور مفکروں نے انجام دیا۔ اس زمانہ کے نامور اصحابِ فکر و فہم جنھوں نے یورپ میں اس مکتب خیال کی تائید و ترویج کی ان میں انسلم[۳] (ANSELM) (۱۰۳۳ - ۱۱۰۹ء) ابیلارڈ[۴] (ABELARD) (۱۰۷۹ - ۱۱۴۲ء)، اکوئیناس[۵] (ACQUINAS) (وفات ۱۲۷۴ء)، ڈنس اسکوٹس[۶] (DUNS SCOTUS) (وفات ۱۳۰۸ء) وغیرہ کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ انسان اور اس کے تمام گوناگوں مفادات اور تمدنی و ثقافتی خواہشات نے ان افراد کے فکری خاکہ میں نمایاں اور اہم مقام حاصل کیا۔ لیکن ان کے فکری خاکوں کی تانوں بانوں کا محور و مرکز کسی بھی طور پر انسان نہیں تھا بلکہ خدا تھا جو ہر شے کا خالق، قائم رکھنے والا اور مٹانے والا تصور کیا جاتا تھا اور کائنات کی ساری چیزیں اُسی کی ذات سے منسلک کی جاتی تھیں۔ قرونِ وسطیٰ کا فلسفۂ انسانیت آخرت پر یقین رکھتا تھا۔ وہ خالقِ کائنات کی ذاتِ پاک کو مخلوق سے علیحدہ تصور کرتا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ انسان کے دینی و دنیاوی معاملات، ان کی ضروریاتِ زندگی اور ان کی روحانی تکمیل کی طرف خاص توجہ صرف کرتا تھا۔ انسانی عقل اس بات کے لئے کوشاں ہوتی ہے۔ کہ وہ لامتناہی اور مکمل علم کو حاصل کرے اور ساتھ ہی اُسے ان مجبوریوں سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے جو اس دنیاوی زندگی میں اس کے ہم فطرت مقصد (CONNATURALEND) کے حصول میں سدِ راہ ہوتی ہیں۔ انھیں بنیادوں پر اکوئیناس (ACQUINAS) نے ایک مفروضہ قائم کیا جس میں اس نے انسان کی اخروی منزلِ مقصود کی جانب نشان دہی کی، اس نے بتایا کہ انسانی فطرت میں تکمیل پذیری کا عنصر حقیقی معنی میں داخل ہے۔ لیکن یہ تکمیل اس محدود دنیاوی عرصۂ حیات میں ممکن نہیں ہے اور نہ ہی اس تکمیل کا انحصار اس کی اپنی قوتوں پر مبنی ہے، انسان بلاشبہ ترقی کرتا ہے لیکن انسانی ترقی بنیادی طور سے ہر ہر قدم پر خدا کے

۳: ALFRED WEBER, HISTORY OF PHILOSOPHY, TRANSLATED BY FRANK THILLY, (U.S.A. 1925) P. 164

۴: ایضاً۔ صفحہ ۔ ۱۷۴

۵: ایضاً۔ صفحہ ۔ ۱۹۱

۶: ایضاً۔ صفحہ ۔ ۱۹۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رحم وکرم کی رہینِ منت ہوتی ہے۔ لہٰذا انسان اپنی فطرتِ عقلی کے مکمل حصول کی تمنا کی تکمیل صرف اسی مملکت کا شہری بن کر کر سکتا ہے جہاں خدا کی حکمرانی و بادشاہت ہو، یعنی وہ ما فوق الانسانی اور ما فوق الفطرت معاشرہ کا فرد بن کر ہی اپنے حصولِ آرزو میں کامیاب وکامران ہو سکتا ہے۔[۷] مزید برآں یہ عقیدہ کہ اسی حصول کو عالمِ امکان میں لانے کے لئے خدا نے اپنے آپ کو اپنی روح کے ذریعے عالمِ بالا سے انسانی قالب میں داخل کیا، عیسائی مسلک کا صحیح معنی میں جز لاینفک قرار دیا گیا۔[۸] ساتھ ہی ساتھ اگر ہم قرونِ وسطیٰ کے تصورِ خدا، تصورِ وحی والہام ونظریۂ کائنات جن پر نصرانی، یہودی اور مسلمان[۹] ایک حد تک متفق ہیں، کا بغور مطالعہ کریں تو یہ بات صاف طور پر سامنے آتی ہے کہ مندرجۂ بالا تصورات انسانی عناصر اور انسان کی بھلائی وبہبودی سے ہم آہنگ ہیں اور اس میں انسان کو ایک حد کے اندر اپنے آپ کو بنانے اور سنوارنے کی مکمل آزادی ہے۔ لیکن اس کا مطمحِ نظر، اس کی ابتدا اور انتہا خدا ہے۔

پندرھویں اور سولھویں صدی میں یورپ میں جو ذہنی انقلاب رونما ہوا، اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے سند (AUTHORITY) پر اعتماد کرنے کے بجائے عقل ودانش پر بھروسہ کرنے کا درس دیا، لیکن

۷: طامس اکوناس (THOMAS ACQUINAS) اٹلی میں نیپلس (NAPLES) کے ایک سربرآوردہ خاندان میں پیدا ہوا تھا۔ ابتدائی عمر ہی سے اسے تعلیم کا شوق تھا۔ اپنے والد کی مخالفت کے باوجود اس نے تعلیمی شغل کو جاری رکھا اور البرٹِ اعظم کی شاگردی اختیار کی۔ ارسطو کے فلسفہ سے اسے ایک والہانہ شوق پیدا ہوا اور اس نے اس میں ایک یکتا مقام حاصل کیا۔ اس کا شمار مدرسیت کو مکمل کرنے والا اور دنیا کے سب سے بڑے نظام آفرینوں میں ہے۔ ازمنۂ متوسط کے دینیاتی مدارس میں اس کا لقب علامہ الٰہی تھا اور اب تک بھی وہ کلیسائے روما کا مستند مفکر شمار ہوتا ہے۔ اس نے تقریباً پچاس سال کی عمر میں ۱۲۷۴ء میں وفات پائی۔ (تاریخ فلسفۂ جدید۔ حصہ اول۔ صفحہ ۱۰)

۸: H. G. DE BURGH, TOWARDS A RELIGIOUS PHILOSOPHY, (LONDON, 1937), PP. 193 - 194.

۹: دیارِ ہندو پاک کے دورِ وسطیٰ کے مسلم مفکرین کے تصورِ خدا، تصورِ وحی والہام اور نظریۂ کائنات کا مطالعہ کرنے کے لئے ملاحظہ کیجئے:

DR. NOOR NABI, DEVELOPMENT OF MUSLIM RELIGIOUS THOUGHT IN INDIA FROM 1200 A.D. TO 1450 A.D. (ALIGARH, INDIA - 1962)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایسا کہنا کسی بھی طور پر بجا اور درست نہیں معلوم ہوتا ہے۔ یہ انقلاب ایک ایسا انقلاب تھا جس نے انسان کے عقلی مفاد کو اجاگر کرنے کی کوشش کی، اس انقلاب نے انسانی فکر کے دھارے کا رُخ یومِ آخرت کی جانب سے موڑ کر موجودہ عالم جو کہ عالم زمان و مکان ہے، کی طرف کر دیا۔ قرونِ وسطیٰ کی فکری زمین جہاں تک فطرت کے مطالعہ و مشاہدہ کا تعلق ہے، بہت ہی غیر آباد اور بنجر تھی۔ اس کی وجہ کچھ تو اس زمانہ کا وہ مابعد الطبیعاتی رجحان تھا جس کی نظر عالمِ حسیات سے پرے عالمِ بالا پر مرکوز تھی اور کچھ اس زمانہ کے طبیعی تحقیق و معلومات پر ارسطو کے ان اصول و قوانین کا اثر تھا جو کہ عالمِ فطرت میں آیا قابلِ استعمال نہیں تھے یا غلط ثابت ہو چکے تھے۔ لیکن اب سبھی چیزوں میں تبدیلی کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ علم ریاضی کے مطالعہ اور اس کے استعمال کے جلو میں عظیم افلاطونی روایت کا احیاء عمل میں آیا اور ساتھ ہی ٹھوس حقائق یعنی مشاہدہ اور تجربہ نے لوگوں کے لیے ایک نئی دلچسپی کے سامان فراہم کئے۔ ان تبدیلیوں کے نتیجے میں ایک نیا علم عالمِ وجود میں آیا۔ ایک ایسے مثبت سائنس کی داغ بیل پڑی جس کا موضوعِ بحث انسان اور فطرت تھے۔ کوپرنیکس (COPERNICUS) اور گیلیلیو (GAILELEO) سے لے کر ہمارے عہد تک عصرِ جدید کی تہذیب و تمدن کی تاریخ دراصل سائنس کے حیرت انگیز کارناموں کی داستان رہی ہے، قدیم نظریۂ کائنات جس میں انسان اور فطرت خدا اور مافوق الفطرت قوی کا رہینِ منت تھا، اس نظریہ کا تقریباً اختتام ہو چکا تھا۔ اور اس کی جگہ ایک ایسے نظامِ فکر کی تعمیر و تشکیل عمل میں آ رہی تھی جس کی تصویر کے انسان اور فطرت دو اصلی اور حقیقی رخ تھے۔ خدا کا تصور دن بدن لوگوں کے دل و دماغ سے مٹتا جا رہا تھا اور فطرت پر تیزی کے ساتھ انسان کے اقتدارِ اعلیٰ کا سکہ جمنے لگا۔[10]

جب ہم اس نئے نظریۂ کائنات کا غیر جانب داری کے ساتھ فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے جائزہ لیتے ہیں۔ تو ہمیں اس بات کا علم ہوتا ہے کہ اس نئے نظریۂ کائنات کی تعمیر و تخلیق رینے ڈیکارٹ[11] (RENE DESCARTES)

۱۰: H.G. DE BURGH, TOWARDS A RELIGIOUS PHILOSOPHY P. 196

۱۱: الفریڈ ویبر۔ تاریخ فلسفہ صفحہ ۲۴۳

رینے ڈیکارٹ: رینے ڈیکارٹ جو فلسفہ جدید کا بانی ہے۔ ۳۱ مارچ ۱۵۹۶ء میں تورین کے ایک باحیثیت خاندان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی نکری کاوشوں کے ہاتھوں وجود میں آئی۔ اُسے غیر مشکوک حقیقت (CERTAIN TRUTH) کی تلاش تھی، ایسی حقیقت جیسا کہ ہم علمِ ریاضی میں پاتے ہیں۔ اس تلاش میں اس نے ماضی کے سارے علوم جن کا انحصار قیاس (SPECULATION) رائے (OPINION) اور سند (AUTHORITY) پر تھا۔ شک و شبہ کی نظر سے دیکھا اور ایک مشہور کلیہ کی تشکیل کی جو "میں سوچتا ہوں۔ اس لئے میرا وجود ہے" (COGI TO ERGO SUM) کے نام سے موسوم ہوا۔ اس بنیادی کلیہ پر ڈیکارٹ نے وجودِ خدا اور وجودِ کائنات کی عمارتیں تعمیر کیں۔ ڈیکارٹ کا یہ طرزِ استدلال ان تمام طریقوں سے بالکل مختلف تھا جو اُس کے پیش رو مفکروں نے اختیار کیا تھا۔ اس کے اس طرزِ استدلال نے حصولِ علم کے تمام دوسرے راستوں کو مسدود کر دیا اور ریاضی سے مشابہ علمِ طبیعات کے لئے راہ ہموار کی۔ یہاں تک کہ خدا اور روح جو بنیادی دقیقی تیقنات (CERTAINTIES) میں شمار کئے جاتے تھے۔ نامعلوم حقائق تصور کئے جانے لگے۔ ان کا مشاہدہ محض وجدان ( ) کے ذریعہ ممکن تھا۔ جب اسپنوزا[12] (SPINOZA) نے خدا کو جوہر (SUBSTANCE) قرار دیا اور کائنات کو خدا کی ذات کا مظہر پیش کرتے ہوئے فلسفہ ہمہ اوست (PANTHEISM) کی تعلیم دی تو ایسا خدا مذہب کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے سے

میں پیدا ہوا، اس نازک اندام بچے سے اوائل عمری میں غیر معمولی قابلیتیں ظاہر ہونے لگیں۔ اس کا باپ اکثر سوالات پوچھتے رہنے کی وجہ سے اسے فیلسوف کے لقب سے پکارا کرتا تھا۔ جب ۲۰-۱۶۱۹ء میں وہ موسم سرما میں دریائے ڈینیوب کے کنارے نوبرگ (NEU BURG) میں مقیم تھا تو اس نے یک بیک ایک ذہنی انقلاب محسوس کیا۔ جس میں وہ عام طریقۂ فکر اس پر منکشف ہوا جو بعد ازاں فلسفہ اور ریاضی دونوں میں اس کے لئے چراغِ ہدایت بنا۔ اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ صحیح طریقہ یہی ہے کہ صرف اسی بات کو تسلیم کیا جائے جو صاف اور بدیہی ہو۔ ہر ایک مشکل مسئلے کے عناصر کو الگ الگ کرنا چاہیئے۔ اور سادہ ترین و سہل ترین بنیاد سے شروع کر کے آہستہ آہستہ نہایت پیچیدہ سوالوں تک پہنچنا چاہیئے۔ یہی وہ عام تحلیلی طریقہ تھا جو اُس کے ذہن پر منکشف ہوا۔ ڈیکارٹ نے ۱۶۵۰ء میں اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔ (تاریخ فلسفہ جدید، جلد اول صفحات ۲۴۱، ۲۴۹)

۱۲: بنڈکٹ اسپائینوزا (BENEDICT SPINOZA)۔

اسپائینوزا کو سترھویں صدی کے مفکرین میں ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ فکر کے تمام سلسلے اس میں آکر مل جاتے ہیں۔ تصوف اور فطرتیت، نظری اور عملی اغراض جو اس کی صدی کے دوسرے مفکرین میں کم و بیش ایک دوسرے کے مخالف نظر آتے ہیں اور جہاں وہ ایک ہی شخصیت میں پائے جاتے ہیں وہاں ان میں باہمی تناقض اور کشمکش واقع ہوتی ہے، ان تمام نظریات کو اس نے منطق کی رو سے

بقیہ صـ ۳۷ پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قاصر ہو گیا۔ لیکن اس عقلیت پسندی (RATIONALISM) کا اقتدار زیادہ دنوں تک برقرار نہیں رہ سکا۔ برطانوی تجربیت پسندوں (BRITISH EMPIRICISTS) نے انسانی دماغ کو صرف غیر مربوط حواس جسمانی (SENSATIONS) کا مجموعہ قرار دیا۔ انسانی شخصیت ان تمام محاسن و خوبیوں کے ساتھ جو زندگی کو خوشگوار وحسین بناتی ہیں، طاق نسیاں میں دم توڑنے لگی اور لاشیئیت میں گم ہو کر رہ گئی۔ صرف فطرت کا واحد وجود باقی رہا، جو ایک بے رحم اور کائنات پر مسلط قانون تصور کیا جانے لگا۔ لیکن زمانے نے پھر پلٹا کھایا اور فطرت اسی فلسفہ کی بنیاد پر محض تصورات اور احساسات کا مجموعہ بن کر رہ گئی جس کا مسکن و معمار انسانی دماغ قرار دیا گیا۔ اس نقطہ نظر کی وضاحت اما نول کانٹ[۱۳] (IMMANUEL KANT) نے اپنے نظریہ "شئے بذاتِ خود" (THING IN ITSELF) جسے وہ 'NOU ME NON' کہتا ہے اور مظاہر یعنی "اشیاء جیسا کہ ہم کو دکھائی پڑتا ہے" (THINGS AS THEY APPEAR) جسے وہ "PHENOMENA" قرار دیتا ہے، میں کی۔ کانٹ کہتا ہے کہ 'نظریاتی عقل' (THEORETICAL REASON) ہمیں صرف "اشیاء جیسا کہ ہمیں دکھائی پڑتا ہے" کا علم عطا کرتی ہے۔ لہٰذا خدا، روح اور حقیقتِ کائنات کا علم ہمیں 'نظریاتی عقل' نہیں دے سکتی ہے کیوں کہ 'نظریاتی عقل' صرف تجربے تک محدود ہے۔ یہ 'عقل عملی' (PRACTICAL REASON)

قائم کرنے کی کوشش کی اور یہ بتانا چاہا کہ اس طرز کے منطقی استدلال ہی کے ذریعے سے ان میں موافقت پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ عظیم ہستی ۲۴ر نومبر ۱۶۳۲ء کو ایمسٹرڈم میں پیدا ہوا اور ۲۱ر فروری ۱۶۷۷ء میں اس نے وفات پائی۔ (تاریخ فلسفہ جدید صفحہ ۳۳۲)

۱۳: ایمنویل کانٹ: ایمنویل کانٹ ۲۲ر اپریل ۱۷۲۴ء کو کونگز برگ (KONIGS BERG) جرمنی میں پیدا ہوا اس کا باپ اسکوچ خاندان سے تھا اور زین سازی کا کام کرتا تھا۔ کانٹ ایک خاموش طبع اور راست کردار شخص تھا۔ جس کی تمام زندگی تفکر کے لئے وقف تھی۔ اس کی زندگی ایک معمولی شہری کی سی زندگی تھی لیکن اس غیر ممتاز ظاہری زندگی کے بطون سے ایسے عظیم الشان افکار ابھرے جنھوں نے انسانی علم اور انسانی زندگی کو روشن کر دیا یہ ممتاز شخصیت ۱۲ر فروری ۱۸۰۴ء کو راہی ملکِ عدم ہوئی۔

تاریخ فلسفہ جدید۔ جلد دوم۔ صفحات ۲۹ تا ۴۲

الفریڈ ویبر۔ تاریخ فلسفہ۔ صفحہ ۳۵۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے جو ہمیں 'بقائے وجود' (IMMORTALITY OF THE SOUL) 'ہستیِ باری تعالیٰ' اور 'اختیار (FREEDOM OF THE SOUL) جیسے اعتقادات کی طرف لے جاتی ہے۔ ہستی باری تعالیٰ پر ایمان کا اصول جس ضرورت سے پیدا ہوتا ہے وہ نہ حسی ہے اور نہ انانیتی بلکہ نفوسِ انسانی میں اخلاقی قانون کی موجودگی کا نتیجہ ہے۔ اس کا ماخذ انسان کی فطرت کی ایک کُلی اور عمومی حقیقت ہے اور 'خالص عقل' (PURE REASON) کا تقاضا ہے۔ اس طرح سے ہم پاتے ہیں کہ انسانی فکر اپنی انتہائی عروج کے باوجود اسی منزل پر عود کر آئی جہاں سے اس نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ ایک خالص انسانیت شعار فلسفہ مابعد الطبیعات (HUMANISTIC METAPHYSICS) جس کی رو سے تمام علم کا انحصار عقلِ انسانی کی خود اعتمادی پر مبنی تھا۔ اس عقل کے دعووں کی نفی کے جلو میں نمودار ہوا جو حقیقتِ اصلی تک رسائی کا مدعی تھا۔ انسان بحیثیتِ عالم اقلیم فلسفہ مابعد الطبیعاتی میں مقتدرِ اعلیٰ تصور کیا جاتا تھا لیکن اب اُسے اس اقتدارِ اعلیٰ سے چار و ناچار دست بردار ہونا پڑا اور عالمِ ظاہر (PHENOMENAL WORLD) کی فریب نظریوں کی محکومی اختیار کرنی پڑی۔[14]

دینیات (RELIGION) کے میدان میں بھی فکر اپنے دائرہ عمل کی تکمیل کر چکی تھی، کیتھولک تقلید پسندی کی اجارہ داری سے پھر کر فکر و عمل کی دھارا پروٹسٹنٹ عقیدہ کی جانب بہ نکلی تھی جس کی تبلیغ و اشاعت کا فریضہ مارٹن لوتھر (MARTIN LUTHER) نے انجام دیا۔ بٹلر (BUTLER) اور والٹیر[15] (VOLTAIRE) نے جس نظریۂ الوہیت (DEISM) کی پُر زور تائید کی تھی اس کا اثر و رسوخ کم ہو رہا تھا اور انسان کی معاشرت پسندی اور مذہب کی ضرورت کا اقرار و اعتراف کیا جانے لگا۔

آگسٹ کومٹے[16] (AUGUSTE COMTE) کا فلسفہ ثبوتیت (PHILOSOPHIC POSITIVE) اس تبدیل شدہ فکر کی پوری طرح غمازی کرتا ہے۔ خدا بحیثیتِ عقل (GOD AS REASON) کے بجائے

۱۴: BURGH, TOWARDS A RELIGIOUS PHILOSOPHY, P. 198

۱۵: الفرڈ ویبر۔ تاریخ فلسفہ۔ ص۔ ۳۳۷۔

۱۶: اگسٹ کونت: اگسٹ کونت ۱۹ر جنوری ۱۷۹۸ء کو ایک راسخ الاعتقاد کیتھولک خاندان میں مون پیلیے کے مقام پر پیدا ہوا وہ کچھ اپنی تصانیف سے اور کچھ ریاضیات کا درس دے کر روزی کماتا تھا، جو کام اس نے اپنے ذمہ لیا۔

باقی صفحہ ۲۹ پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عقل بحیثیتِ خدا (REASON AS GOD) اور خدا انسان (GOD-MAN) عقیدہ کے بجائے انسان خدا (MAN - GOD) عقیدہ پر لوگوں نے ایمان ویقین رکھنا شروع کر دیا تھا۔ انسان کامل کا قدیم تصور جس کی داغ بیل اس نظریۂ نجات (SALVATIOV) نے ڈالی تھی جس کا محور ومرکز خدا تھا۔ لیکن اب بجائے خدا کے انسان نے خود اپنے آپ کو اللہ قرار دیدیا۔

اِس طرح فلسفۂ انسانیت مختلف فلسفیانہ نظریات میں سب سے آسان نظریہ تصور کیا جانے لگا۔ جس کا مقصد اس امر کا مشاہدہ کرنا ہوگیا کہ فلسفیانہ مسائل عالمِ انسان سے متعلق ہوں اور ان مسائل کا حل انسانی دماغ انسانی تجربات کی مدد لے کر پیش کرے۔ یہی وہ نصب العین تھا جس نے فرانس میں فلسفۂ انسانیت کے پیامبروں کو زمانہ انقلاب اور اس کے بعد بھی دعوتِ فکر وعمل دی۔ کونڈورسٹ (CONDORCET) سینٹ سیمون (SAINT SIMON) کومٹے (COMTE) اور دیگر اصحابِ فکر وفہم نے اس نصب العین کی نمایاں ترویج وتائید کی۔ اس نظریہ کا سب سے نفیس اور عمدہ تخیلی اظہار جارج سینڈ (GEORGE SAND) نے اپنی ناولوں میں کیا ہے جو عقلیت پسندوں میں سب سے زیادہ رومانوی اور رومانوی اصحابِ فکر میں سب سے زیادہ عقلیت پسند تھا۔ برطانیہ میں بنتھم[17] (BENTHAM)، جیمس مل[18] (JAMES MILL) اور

وہ دو قسم کا تھا۔ اوّل یہ کہ ذہنی سائنس کو ایجابی (POSITIVE) سائنس بنایا جائے اور دوئم یہ کہ تمام ایجابی علوم کے امور وقوانین واسالیب کو منظم طور پر پیش کیا جائے۔ اس طرح سے مستقبل کے نظریۂ کائنات کی تاسیس ہوگی۔ وہ کہتا تھا کہ دینیات اور تخیلی فلسفے کا زمانہ گذر چکا ہے۔ اب انسان کی نجات ایجابی فلسفے (POSITIVISM) ہی میں ہے۔ انسان رفتہ رفتہ اس قسم کے سوالات کرنا چھوڑ دے گا جن کا ایجابی سائنس کوئی جواب نہیں دے سکتی۔ کونت ارتقائے تہذیب کی تین منزلیں قرار دیتا ہے، دینیاتی، مابعد الطبیعاتی اور ایجابی۔ اور پھر بتاتا ہے کہ ان مختلف ادوار کے ساتھ مختلف عمرانی نظامات وابستہ ہوتے ہیں۔ قانون منازلِ ثلاثہ کونت کے فلسفے کا ایک اساسی مسئلہ ہے۔ وہ نقلِ مسیح کو انسانی فطرت پر ایک عظیم الشان نظم تصور کرتا تھا۔ اس کو پڑھتے ہوئے وہ خدا کی جگہ انسانیت کا لفظ رکھ دیتا تھا۔ اس طرح آخری عمر میں وہ مذہبِ انسانیت کے امام کے نام سے موسوم ہوگیا۔ ۵ ستمبر ۱۸۵۷ء کو وہ دار البقاء کو سدھارا۔ (تاریخ فلسفۂ جدید۔ جلد دوم ۳۷۱ - ۳۸۲۔)

۱۷ : جیریمی بنتھم کی پیدائش لندن کے ایک سربرآوردہ خاندان میں ۱۷۴۸ء میں ہوئی۔ وہ برطانوی افادیت پسندوں کا پیشوا کہلاتا ہے۔ اس نے گوناگوں پارلیمانی اصلاحات نافذ کیں۔ ۱۸۳۲ء میں اس نے اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔

(THE CONCISE ENCYCLOPAEDIA OF WESTERN PHILOSOPHY AND PHILOSOPHIRS- EDITED BY J.O. URMSON ([illegible] HUTCHINSON & CO., P. 60)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کے ہم مشرب و ہم خیال اصحاب فکر نے جو غیر تخیلی (UN-IMAGINATIVE) اور غیر رومانوی (UN-ROMANTIC) تھے، اس نظریہ کو مسلم الثبوت عقیدہ کے طور پر اپنایا۔ اس مکتبِ فکر کے مرکزی اجزاء کا خلاصہ مندرجہ ذیل نقاط میں پیش کیا جاتا ہے:

(۱) انسان فطری طور پر نیک اور کریم النفس واقع ہوا ہے، اس کے اندر حصولِ کمال کی شاہ راہ پر آگے بڑھتے رہنے کی بے پناہ اور لامحدود صلاحیت موجود ہے۔

(۲) انسانی تہذیب و تمدن کی مزید ترقی و کامرانی کی راہ میں کوئی بھی ناقابلِ عبور رکاوٹ حائل نہیں ہے خرابیاں اور برائیاں جو سدِ راہ ہوتی ہیں، معاشرہ کی ناقص تنظیم کی وجہ سے وجود میں آتی ہیں جن کی اصلاح دانشمندانہ قانون سازی کے ذریعہ ممکن ہے۔

(۳) اگر فرد کو پوری آزادی ودیعت کر دی جائے تو وہ اس کو اپنی فلاح و بہبود کے لئے استعمال کریگا۔ اور ساتھ ہی معاشرہ کے سبھی دوسرے افراد کی خوش حالی و بہبودی بھی اس کے پیشِ نظر ہو گی۔

(۴) یہ خوش حالی و بہبودی جو ساری کاوشوں کا مقصود و مطمحِ نظر ہے بنیادی طور پر مادی آرام و آسائشوں پر مشتمل ہے۔ یعنی ہر انسان کے تصرف میں کم از کم اس قدر دنیاوی سامان ہو کہ وہ خوشحالی و آسودگی کی زندگی گزار سکے۔

(۵) انسانی عقل اس تخیلی و معیاری منزلِ مقصود کی جانب رہنمائی کرتی ہے جو توہمات کی تاریکیوں کا قلع قمع کرتی ہے اور اپنے ہم رفتار کے لئے انسان کی فطری و جبلی انس و محبت کی راہوں کو ہموار کرتی ہے۔ اس کے علاوہ سائنسی معلومات کی توسیع و اشاعت جو انسان کو فطرت کے اوپر لامحدود قوت و قدرت کی

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) ۱۸ : جیمس مل، جیمس مل کی پیدائش ۱۷۷۳ء میں اسکاٹ لینڈ کے ابرڈین شائر میں ہوئی۔ مل نے اڈن برگ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۰۸ء میں لندن میں اس کی ملاقات بنتھم سے ہوئی۔ اس نے بنتھم کو اپنا ہم خیال بنا لیا اور دونوں نے مل کر نظریۂ جمہوریت کی پُرزور تبلیغ و اشاعت کی، یہ دونوں نظریۂ لذتیت (HEDONISM) کے حامی و علمبردار تھے۔ مل نے ۱۸۳۶ء میں اس عالم زمان و مکان کو الوداع کہا۔

(THE CONCISE ENCYCLOPAEDIA OF WESTERN PHILOSOPHY AND PHILOSOPHERS, P. 264)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خوش خبری دیتی ہے اس تخیلی منزلِ مقصود تک انسان کی رسائی میں کما حقہٗ ہاتھ بٹاتی ہے۔[19]

لیکن اس سائنسی فلسفۂ انسانیت کا سرچشمہ جس کی نمائندگی اس کے آخری دنوں میں ٹینی[20] (TAINE) (۱۸۲۸ - ۱۸۹۳ء) اور رینان[21] (RENAN) (۱۸۲۳ - ۱۸۹۲ء) نے کی جو کومٹے کے پرُشوق و سرگرم پیرو کار تھے، خشک ہوگیا۔ انیسویں صدی عیسوی کے اختتام کے قبل ہی ایک نیا اندازِ فکر انسانی دل و دماغ پر اپنا تسلط جمانے لگا تھا۔ ان اصحابِ فکر میں کچھ تو ایسے تھے جو خدا اور مذہب کو تسلیم کرتے تھے اور کچھ ایسے تھے جو یا تو مذہب کی طرف سے غیر جانب داری کا دم بھرتے تھے یا مخاصمانہ رویہ رکھتے تھے۔ لیکن سبھی اس دعویٰ کی تردید میں کہ سائنسی عقل کا انسانی فکر و زندگی پر پورا تسلط ہے، متفق تھے۔[22] اور اس طرح ہم بیسویں صدی کی ان تحریکوں سے آشنا ہوتے ہیں جو فلسفۂ انسانیت کی حامی و علمبردار ہیں، ان میں نظریۂ عملیت (PRAGMATISM)، نظریۂ وجودیت (EXISTENTIALISM) اور نظریۂ اشتراکیت (MARXISM SOCIALISM) خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔

اف، سی، ایس، شیلر[23] (F.C.S. SCHILLER) جو نظریۂ افادیت کے زبردست حامی تھے۔ فلسفۂ انسانیت کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں " فلسفۂ انسانیت ایک ایسا فلسفیانہ اندازِ فکر ہے جو

۱۹: BURGH, TOWARDS A RELIGIOUS PHILOSOPHY, P. 193

۲۰: الفریڈ ویبر - تاریخ فلسفہ - ص - ۴۶۵۔

۲۱: " " " "

۲۲: BURGH, TOWARDS A RELIGIOUS PHILOSOPHY, P. 201

۲۳: فردی نانند کاننگ اسکوٹ شیلر: شیلر کی پیدائش برطانیہ میں ۱۸۶۴ء میں ہوئی تھی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد کورپس کرسٹی کالج آکسفورڈ میں بحیثیتِ فیلو کے ان کا تقرر ہوا۔ اور بعد میں جنوبی کیلیفورنیا یونیورسٹی نے ان کو فلسفہ کے پروفیسری کے ممتاز عہدہ سے نوازا۔ شیلر کو ولیم جیمس سے گہری دوستی تھی لہٰذا وہ ان کے فلسفۂ عملیت (PRAGMATISM) سے گہری انسیت رکھتا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہیئے کہ ولیم جیمس کی صحبت نے انہیں فلسفۂ عملیت سے دلچسپی پیدا کی۔ شیلر نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ میں ذاتی طور پر بغیر فلسفۂ عملیت کے علم اور مطالعہ کے ان کے بنیادی نقاط تک پہنچ چکا تھا جیمس کے نقطۂ نظر کی تائید کرنے کے باوجود شیلر نے اپنے فلسفہ کو فلسفۂ انسانیت (HUMANISM) اور بعد میں 'VOLUNTARISM' کے نام سے موسوم کیا۔ اس بندۂ خدا نے ۱۹۳۷ء میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔
(THE CONCISE ENCYCLOPAEDIA OF WESTERN PHILOSOPHY AND PHILOSOPHERS - P. 358)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنی فکری کاوشوں کے تجربہ کو مقدم (APRIORI) ثابت کرنے کی کوشش میں صرف نہیں کرتا ہے بلکہ انسانی تجربہ کائنات پر انسانی تجربہ سے دسترس حاصل کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ انسان کو اپنی فطری صلاحیت کے ساتھ اس تجربہ کے لئے بحیثیت ایک مبتدی کے کافی تصور کرتا ہے بجائے اس کے کہ وہ اس بات پر اصرار کرے کہ پہلے انسان اپنے اندر اپنی تمام خواہشات کو ترک کر کے سائنسی اصطلاحات میں قابلیت پیدا کرے اور پھر وہ تجربہ کی دنیا میں قدم رکھے۔"[۲۴]

شیلر پروٹوگوراز (PROTOGORAS) کے اس مقولہ کی کہ 'انسان ساری چیزوں کا پیمانہ ہے' (MAN IS THE MEASURE OF ALL THINGS) پُرزور طریقے سے تائید کرتا ہے۔ وہ مزید کہتا ہے کہ پروٹوگوراز کا یہ مقولہ سائنس سے اس بات کا تقاضہ کرتا ہے کہ وہ ان طریقوں کو دریافت کرے جس سے انسان چیزوں کی پیمائش کر سکے اور ساتھ ہی ساتھ اپنی پیمائشوں کو دوسرے انسانوں کی پیمائشوں سے ہم آہنگ بنا سکے۔ انسان ایک سماجی (SOCIAL) مخلوق ہے لہٰذا فلسفۂ انسانیت پر فطری طور سے یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اس نظریہ کو سراہے کہ کائنات بنیادی و اساسی حیثیت سے مشترک سرمایہ (A JOINT-STOCK AFFAIR) ہے۔ مزید برآں وہ ان ساری کاوشوں کا جو کہ انسانی شخصیت کو اجاگر کرنا چاہتا ہے پُرجوش خیر مقدم کرے۔[۲۵] (باقی)

۲۴: F. C. S. SCHILLER, HUMANISM PHILOSOPHICAL ESSAYS (LONDON, 1912) PP. XXIII – XXIV.

۲۵: تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ ایضاً۔ صفحات۔ ۲۴۸ – ۲۴۹۔

ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت

مؤلفہ :- سید مناظر احسن صاحب گیلانی مرحوم

ہندوستان اپنا وطن بنانے کے بعد اس ملک کیلئے مسلمانوں نے تعلیم و تربیت کا جو نظام قائم کیا تھا اس کی دلآویز تفصیل طلباء کا قیام و طعام، کتابوں کی فراہمی، کتابت کا فن، اشاعتِ کتب کے طریقے، کاغذ سازی کو ہندوستان میں رواج دینا۔ کاغذ کے اقسام، سلاطین اور علماء، بیرونِ ہند میں اسلامی علماء کا امتیاز اور دوسرے مباحث کے بعد یہ مسئلہ چھیڑا گیا ہے کہ تعلیم کو دینی و دنیوی خانوں میں بانٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جلد اول ۹/۰ مجلد ۱۰/- (جلد دوم زیرِ کتابت)

ملنے کا پتہ :- مکتبہ [illegible] اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

© rasailojaraid.com